"منکر حدیث" کے حوالے سے استفسار

خلاصہ: یہ تحریر ایک سوال کے جواب میں رقم کی گئی ہے۔ یہ سوال فیس بک پر مصنف کے ایک نوٹ پر کیا گیا ہے[1]۔ سوال کا متن اس تحریر میں نقل کیا گیا ہے۔ سائل کے مطابق اگر کوئی شخص ایسی حدیث کو رد کرتا ہے، جسے اجماع امت کی تائید حاصل ہوتی ہے، تو اس شخص کو "منکر حدیث" کہا جائے گا، چاہے وہ شخص اپنے "منکر حدیث" ہونے کا انکار کرے۔ راقم الحروف نے اس سوال کا تجزیہ کیا ہے۔ اس سوال میں بنیادی پیچیدگی یہ ہے کہ ایسے شخص کو منکر اجماع کہنا چاہیے، "منکر حدیث" یا منکر اجماع و حدیث۔ راقم الحروف نے یہ بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ ایک اکیلا سوال نہیں۔ بلکہ یہ بہت سے اہم اصولی و فقہی مسائل سے تعرض کرتا ہے۔ راقم نے کوشش کی ہے کہ ان مسائل کی نشان دہی کی جائے اور ان کی اہمیت کو اجاگر کیا جائے۔ ان مسائل کو ایک دو صفحوں پر مشتمل تحریر کی نذر کرنا قطعا درست نہیں۔ ان مسائل کی معرفت کے لیے سنجیدہ مطالعہ اور دقیق تحقیق کی ضرورت ہے۔

[1] یہ نوٹ فیس بک کہ اس لنک پر دیکھا جا سکتا ہے:
(https://www.facebook.com/photo.php?fbid=212765035793556&set=a.177933425943384.1073741827.100011801826878&type=3&theater)

طارق عباس صاحب کا سوال پیش ہے:

"جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ہر مذہب ایک set of beliefs رکھتا ہے۔ یہ set of beliefs اس مذہب کو دوسرے مذاہب سے ممتاز کرتی ہے۔ ان set of beliefs میں اضافہ ممکن ہے اور نہ ہی کمی۔

اسی تناظر میں فرض کیجئے کہ حیاتِ مسیح کے عقیدے پر اگر کوئی اپنی subjective understanding کو impose کرتا ہے۔ اور explicitly یہ کہنے کی جسارت کرتا ہے کہ چونکہ میرا فہمِ قرآن کہتا ہے کہ حضرت عیسیٰ وفات پا چکے ہیں لہٰذا اجماعِ اُمت اور بُخاری میں موجود روایات دونوں باطل ہیں (اور حیرت انگیز طور پر اسماء الرجال کی "تحقیق" بھی اُن کے حق میں "ثابت" ہو جاتی ہے) تو شاید اُمت انہیں اجماعِ امت کی بناء پر مُنکرِ حدیث کہہ سکتی ہے کہ انہوں نے اپنے اُصولِ فہمِ قرآن کو حدیث پر مُقدم ٹھہرایا۔ اور تھوڑی بہادری کا مُظاہرہ کرے تو شاید ان کے مسلمان ہونے کو بھی question کر سکتی ہے۔ اور یہ صاحب اگر اس علمی پوزیشن کو اختیار کئے ہونے کے باوصف اپنے آپ کو مُنکرِ حدیث نہیں کہتے تو شاید ہماری اور ان کی انکارِ حدیث کی definition میں فرق ہو گا.

(نوٹ: میری یہ ساری گُفتگو اپنی understanding کو بہتر بنانے کیلئے ہے، نہ کہ میں اس غلط فہمی کا شکار ہوں کہ آپ سے علمی مباحثہ کر سکتا ہوں) "

جواب بعون اللہ تعالیٰ:-

اس سوال کو تین فصول میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی فصل ایک اصول کا بیان ہے۔ دوسری فصل انکار حدیث اور انکار اجماع سے متعلق ہے۔ تیسری فصل اصول فہم قرآن وحدیث سے تعرض کرتی ہے۔

اول فصل: بیان اصول—عقائد کی فہرست

دوم فصل: انکار حدیث بوجہ انکار اجماع

سوم فصل: اصول فہم حدیث

اول فصل: بیان اصول—عقائد کی فہرست

اسلام کی بنیاد عقائد ہیں۔ انھی عقائد کی بنا پر وہ باقی مذاہب سے ممتاز ہے۔ ان عقائد کی فہرست میں کمی بیشی ممکن نہیں۔ جو کوئی ان میں کمی بیشی کا مرتکب ہوتا ہے، اسے اس مذہب سے خارج تصور کیا جاتا ہے۔ ان عقائد پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ ان عقائد کا علم عامۃ المسلمین کے پاس پایا جاتا ہے۔ یہ علم حاصل کرنے کے لیے کسی استاذ، مدرسہ اور اسکول کی ضرورت نہیں۔ اسلام کی بنیادی شرط ہی ان عقائد کا اقرار ہے۔ ان عقائد کو مانے بغیر کوئی شخص مسلمان ہونے کا دعوی نہیں کر سکتا۔ جس کا مطلب ہے کہ ان عقائد کا علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے: اسلام میں داخل ہونے کے لیے ان عقائد کو جاننا اور ان کی تصدیق کرنا ضروری ہے۔

یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن ایک بات سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وہ یہ کہ جس امر کو ہم عقیدہ کا عنوان دے رہے ہیں اور جس کے انکار کو ہم باعث تکفیر سمجھتے ہیں، کیا وہ عقیدہ اسی نوعیت کا ہے، جس نوعیت کا اوپر بیان گذر چکا ہے۔ یعنی:

- کیا وہ عقیدہ شرط اسلام ہے؟
- کیا اس عقیدہ کا علم حاصل کرنا اور اس کی تصدیق کرنا ہر ایک مسلمان پر فرض ہے؟
- کیا وہ عقیدہ تمام مسلمانوں کے مابین متفق ہے؟

ان سوالوں کا جواب اگر اثبات میں ہے، تو اسی صورت میں اس عقیدہ کا انکار کسی بڑے حکم کا سبب بن سکتا ہے۔ ورنہ نہیں۔ عقائد کی فہرست میں ایسے فرعی عقائد بھی شامل کیے جاتے ہیں، جو ان شرائط کو پورا نہیں کرتے۔ بعض مسلمان ان عقائد کو مانتے ہیں، بعض نہیں مانتے۔ ایسے عقائد کا اثبات / انکار معیار اسلام نہیں۔ اس کی مثال جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حاضر و ناظر ہونے کے عقیدے کی دے جاسکتی ہے[2]۔ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر و ناظر مانتے ہیں، وہ بھی مسلم ہیں اور جو اس عقیدہ کو درست نہیں سمجھتے، وہ بھی مسلم ہے۔ درست نہ سمجھنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کی نظر میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم حاضر و ناظر نہیں ہے۔ یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حاضر و ناظر ہونے پر نفی یا اثبات میں کوئی شرعی دلیل موجود نہیں۔ اسے ماننے اور نہ ماننے والے دونوں امت کا حصہ ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ عقیدہ بھی کفر و شرک کا موضوع رہا ہے۔ اس کے انکار کو کفر اور اقرار کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ لیکن مسلمانوں کی تاریخ میں بالعموم اسے اسلام کا معیار نہیں بنایا گیا۔ امت کے مجموعی عمل سے بہت واضح ہے کہ اگر کوئی شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حاضر و ناظر ہونا کا عقیدہ رکھتا ہے اور جو یہ عقیدہ نہیں رکھتا، دونوں مسلمان ہیں؛ انھیں اسلام سے خارج تصور نہیں کیا جائے گا۔ چناچہ دیکھنے کی ضرورت یہ ہے کہ جس عقیدہ کا انکار کیا جارہا ہے، اس عقیدے کی نوعیت کیا ہے۔ ہر طرح کے عقیدہ کا انکار باعث تکفیر نہیں بن سکتا۔

دوم فصل: انکار حدیث بوجہ انکار اجماع

سوال کی عبارت سے واضح نہیں ہوتا کہ "منکر حدیث" کا عنوان اور ممکنہ تکفیر کا حکم انکار حدیث کی وجہ سے لگایا جارہا ہے یا انکار اجماع کی وجہ سے۔ یہ احتمال اس لیے پیدا ہوتا ہے کیونکہ زیر بحث سوال انکار حدیث

---

[2] ازراہ مہربانی یہ ذہن میں رکھیے کہ میں ان عقائد کے صحیح و غلط ہونے کا فتوی نہیں دے رہا۔ میں صرف بنیادی اور فرعی عقائد کے فرق کو سمجھانے کی کوشش کر رہا ہو۔ میرے علم کی حد تک کوئی مسلمان یہ نہیں کہہ سکتا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ اسی درجے کا ہے جس درجہ کا عقائد توحید، رسالت، معاد وغیرہ ہیں۔

کے مسئلے سے اٹھا ہے۔ انکار اجماع کی صورت میں محض "منکر حدیث" کا عنوان کفایت نہیں کرتا؛ منکر اجماع بھی کہنا چاہیے۔

سوال کی عبارت کو فہم متن کے لیے خود مکتفی سمجھیں، تو محسوس ہوتا ہے کہ محض انکار حدیث "منکر حدیث" کے عنوان کے لیے کافی جرم نہیں۔ بلکہ اس حدیث کا انکار "منکر حدیث" کے عنوان پر منتج ہوتا ہے، جس حدیث کو اجماع کی تائید حاصل ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے "منکر حدیث" کی تعریف یہ بنتی ہے:

تعریف: "منکر حدیث" وہ ہے جو اس حدیث کا انکار کرے جسے اجماع امت کی تائید حاصل ہو۔

لیکن معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ یہ تعریف درست محسوس نہیں ہوتی۔ اس تعریف سے نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر اجماعی امور کو چھوڑ کر باقی تمام احادیث کی تردید کر دی جائے، تو اسے انکار حدیث کے مترادف نہیں سمجھا جائے گا۔ اجماعی امور بلاشبہ گنے چنے ہیں۔ ان امور کو قبول کرنے کے بعد باقی تمام احادیث کو رد کرنے کا رستہ کھل جاتا ہے۔ اس لیے یہ تعریف درست نہیں۔

سوم فصل: اصول فہم حدیث

انکار حدیث کے مسئلے میں بنیادی سوال ہی یہ ہے کہ حدیث کے دائرے میں کس امر کا انکار "منکر حدیث" کے عنوان کا مستحق ہے۔ یہ سوال انتہائی اہم ہے۔ اس سوال کا جواب ہر اس شخص کے پاس ہونا ضروری ہے، جو کسی کے "منکر حدیث" ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس حوالے سے یہ نکات اہم ہیں:

حدیث کے باب میں ردو قبول کا اختیار

سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ کیا کسی فقیہ کو حدیث ترک کرنے کی اجازت ہے۔ اگر اس سوال کا جواب نفی میں ہے، تو جاننے کی ضرورت یہ ہے کہ کیا ہمارے اسلاف نے تمام احادیث کو "أمنا و صدقنا" کہہ کر قبول

کر لیا تھا۔ کیا انھوں نے حدیث کے دائرے میں رد و قبول کے اختیار کو کبھی استعمال نہیں کیا؟ اگر اس سوال کا جواب اثبات میں ہے، تو ہمارے اسلاف کے ترک حدیث اور انکار حدیث کے موقف میں کیا جوہری فرق ہے۔ جاننے کی ضرورت یہ ہے کہ وہ کونسے حدود و قیود ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے ہمارے اسلاف نے احادیث کے دائرے میں ردو قبول کے اختیار کو استعمال کیا۔ کیا انھی حدود و قیود کا خیال نہ رکھنے والا "منکر حدیث" ہے؟ راقم کی نظر میں یہ سوال اس مسئلہ میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سوال کا جواب ہمیں اس مسئلے کا شافی حل فراہم کر سکتا ہے۔

ایک حدیث کو چھوڑ کر دوسری حدیث کو قبول کرنا

دوسرا سوال یہ ہے کہ کیا ایک حدیث کو ترک کر کے دوسری حدیث کو اختیار کرنے کی اجازت ہے۔ اگر ہم کہیں کہ اجازت نہیں ہے، تو ہمیں اس سوال کا سامنا کرنا پڑے گا کہ دو احادیث کے تعارض کی صورت میں دونوں احادیث پر عمل کیسے کیا جائے۔ یہ تکلیف مالا یطاق ہے۔ اس صورت میں یقینا ایک حدیث کو ترک کرنے پڑے گا۔ اگلا سوال یہ ہو گا کہ تعارض کی صورت میں جب ایک حدیث کو ترک کیا جا سکتا ہے، تو اکیلی حدیث کو ترک کیوں نہیں کیا جا سکتا۔ تعارض کی صورت میں فقیہ اپنے استدلال کی قوت سے ایک حدیث کو قبول کرتا ہے اور دوسری کو ترک۔ استدلال کی قوت سے فقیہ اکیلی حدیث کو ترک کیوں نہیں کر سکتا؟ اس سوال کا ایک جواب امام شافعی رحمہ اللہ نے دیا ہے اور دوسرا جواب امام مالک رحمہ اللہ اور احناف نے۔ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ ان میں سے کون سا جواب درست ہے۔ البتہ امت نے ان دونوں جوابوں کو قبول کیا ہے[3]۔

[3] ایک حدیث کو ترک کر کے دوسری حدیث کو قبول کرنے کی صورت میں بحث اٹھائی جا سکتی ہے کہ زیر بحث فقیہ نے ایک حدیث کو محض اس لیے ترک کیا ہے کیونکہ یہ اس کے علمی و غیر علمی مقاصد کے ساتھ لگا نہیں کھاتی۔ چونکہ اس نے ایک حدیث کو محض اپنے مقاصد کی خاطر ترک کیا ہے، اس لیے وہ انکار حدیث کا مرتکب ہوا ہے۔

اصول و قواعد کی روشنی میں فہم حدیث

حدیث کے حوالے سے یہ بحث بھی جاننا ضروری ہے کہ کیا احادیث کو اصول و قواعد کی روشنی میں سمجھنے اور بر بنائے اصول و قواعد ان احادیث کی تاویل/تردید کی اجازت ہے۔ کیا ہمارے اسلاف اصول و قواعد کی روشنی میں احادیث کا فہم حاصل کیا کرتے تھے۔

حدیث کی تاویل کرنا

کیا احادیث کی تاویل کی اجازت ہے؟ اگر تاویل کی اجازت ہے، تو کیا ہر طرح کی تاویل قابل قبول ہے یا صرف تاویل کی کچھ خاص صورتوں کی اجازت ہے۔ باقی ہر تاویل ممنوع ہے۔ اس بحث کا فنی پہلو یہ ہے کہ کیا حدیث کی "ظاہر" پر تاویل کی جائے گی یا اسے اس کے "ظاہر" سے پھیرنے کی اجازت ہے۔ امام شافعی کے نزدیک حدیث کو اس کے "ظاہر" پر تاویل کیا جائے گا۔ ان کی نظر میں حدیث کو اس کے "ظاہر" سے پھیرنا حدیث کی تردید کے مترادف ہے۔

قرآن وسنت کی روشنی میں احادیث کی تفہیم

کیا احادیث کو قرآن و سنت کی روشنی میں سمجھنا جائز ہے۔ اس بحث کا فنی پہلو دینی مآخذ کی سند اور دلالت سے متعلق ہے۔ سند اور دلالت کے اعتبار سے نصوص کو درج ذیل چار صورتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

- قطعی الثبوت و قطعی الدلالۃ
- قطعی الثبوت و ظنی الدلالۃ
- ظنی الثبوت و قطعی الدلالۃ
- ظنی الثبوت و ظنی الدلالۃ

مزید تفصیل یہ ہے:

ثبوت کے حوالے سے عام طور پر دو صورتوں پر اتفاق پایا جاتا ہے: تواتر اور خبر واحد۔ مشہور محل اختلاف ہے۔ تواتر سے حاصل علم کی نوعیت میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے، اگرچہ یہ اختلاف بہت زیادہ فقہی نتائج کا حامل نہیں۔ ایک مکتبۂ فکر کے نزدیک تواتر اضطراری علم فراہم کرتا ہے اور دوسرے کے نزدیک تواتر نظری قطعی علم پیدا کرتا ہے۔ اس میں بھی مزید تفصیل ہے، لیکن اس تفصیل میں جانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ قرآن مجید کے حوالے سے اتفاق پایا جاتا ہے کہ یہ تواتر سے نقل ہوا ہے۔ اس تناظر میں سوال یہ ہے کہ کیا قرآن مجید کو خبر واحد پر فوقیت دی جائی گی۔ علی ہذا القیاس، کیا خبر متواتر کو خبر واحد پر فوقیت دی جائے گی۔

- کونسی اخبار متواتر ہیں؟
- تواتر کو کیسے طے کیا جائے گا؟
- متواتر اخبار کو خبر واحد پر ترجیح دی جائے گی؟

اس حوالے سے بہت اہم بحث عمل اہل مدینہ ہے۔ عمل اہل مدینہ کے حوالے سے یہ جاننا ضروری ہے کہ:

- عمل اہل مدینہ سے کیا مراد ہے؟
- کیا عمل اہل مدینہ حجت ہے؟
- عمل اہل مدینہ میں کونسے امور شامل ہیں؟
- کیا عمل اہل مدینہ کو خبر واحد پر ترجیح دی جائے گی؟

خبر واحد موضوعات کا ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔ یہی سے حدیث کی بحث شروع ہوتی ہے۔ اس میں جن اہم موضوعات کو دیکھنے کی ضرورت ہے، وہ یہ ہیں:

- خبر واحد سے وجوب علم کی بحث
- خبر واحد سے وجوب عمل کی بحث
- خبر کا صدق و کذب کیسے طے ہوتا ہے؟
- خبر واحد سے حاصل علم کی نوعیت کیا ہے؟
- قرائن کی تائید کی صورت میں خبر واحد سے حاصل علم کی نوعیت کیا ہے؟
- خبر واحد کی اقسام
- خبر واحد سے تعبد واقع ہوتا ہے یا نہیں؟
- مرسل کا حکم
- مشہور کا حکم
- اقوال صحابہ
- اقوال تابعین
- ترجیح اخبار کا مسئلہ
- سند کی بحثیں: راوی، راوی کی عدالت، اسناد کی نوعیت، سند کی علتیں

تفہیم متن کے لیے جو اصول کسی بھی فقیہ کے نزدیک متعبر ہوسکتے ہیں، وہ بھی اہم ہیں:

- خاص، عام، مشترک، موؤل
- ظاہر، نص، مفسر، محکم ---- خفی، مشکل، مجمل، متشابہ
- حقیقت، مجاز، صریح، کنایہ
- استدلال بر بنائے عبارت، اشارت، دلالت اور اقتضائے دلالت

خبر کے حوالے سے علمی مسائل کی یہ فہرست جامع و مانع نہیں۔ بلکہ اس میں اجماع کے مسائل اور اس سے متعلق مباحث کو بھی شامل کر لیجیے۔ دیکھنے کی ضرورت یہ ہے کہ ان علمی مسائل کے حوالے سے امت میں کیا مواقف پائے جاتے ہیں۔ کونسے مباحث محل اختلاف ہیں اور کن موضوعات پر اتفاق ہے۔ جن مباحث پر اختلاف ہے، ان میں اختلاف کی نوعیت کیا ہے۔ جن موضوعات پر اتفاق ہے، ان کی امت کے نزدیک اہمیت کیا ہے۔ یعنی کیا وہ موضوعات مسلم اور غیر مسلم میں امتیاز کا درجہ رکھتے ہیں۔ اگر امتیاز کا درجہ رکھتے ہیں، تو امتیاز کرنا ازبس ضروری ہے۔

ظاہر ہے کہ حدیث کے حوالے سے بنیادی اہمیت کے حامل اصول ہی کسی بڑی تنکیر و تعظیم کا موضوع بن سکتے ہیں۔ یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ فہم دین کے دائرے میں بہت سے بنیادی اصولوں میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ امت نے اس اختلاف کو بھی کھلے دل کے ساتھ قبول کیا ہے۔ یہ اختلاف بنیادی ہے، لیکن معیار حق و باطل نہیں۔ اس کے ماننے والے حق پر اور نہ ماننے والے باطل پر نہیں سمجھے جاتے۔ اس اختلاف کا دائرہ صحیح اور غلط پر مشتمل ہے۔ حق و باطل کا دائرہ اور صحیح اور غلط کا دائرہ الگ الگ ہے۔ انھیں گڈ مڈ نہیں کرنا چاہیے۔ یہی سارے علمی فساد کی جڑ ہے۔ صحیح اور غلط کی بحث جب حق و باطل کی لڑائی بن جاتی ہے، تب تمام حدود بے معنی ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ حق و باطل کی لڑائی میں مرد مومن اپنی جان بھی قربان کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ لیکن جاننے کی ضرورت یہ ہے کہ جس گھمسان کی جنگ کو ہم نے حق و باطل کا

معرکہ بنادیا ہے، وہ خدا کی نظر میں بھی ایسے ہی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم جان بھی گنوا دیں اور آخرت میں لینے کے دینے پڑ جائیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم حدیث کے دائرے میں ان اصولوں کو متعین کریں، جو بنیادی اور امتیازی اہمیت کے حامل ہیں۔ جزوی مسائل میں اختلاف کو طعن و تشنیع اور دشنام طرازی کا موضوع بنانا انتہائی غیر علمی اور غیر اخلاقی رویہ ہے۔ اسلام اس کی اجازت ہرگز نہیں دیتا۔ مثال کے طور پر امام مالک رحمہ اللہ اجماع اہل مدینہ کے قائل ہیں۔ امام شافعی رحمہ اللہ اس اجماع کو سرے سے کوئی اہمیت نہیں دیتے، بلکہ ان کی نظر میں یہ "اسم بغیر مسمی" ہے۔ اس اصول کی روشنی میں امام مالک رحمہ اللہ نے کئی فتاوی ارشاد فرمائے۔ امام شافعی نے نہ صرف اس اصول کو چیلنج کیا، بلکہ اس اصول کے تحت جو چیز حلال قرار دی گئی تھی، اسے حرام قرار دیا؛ جو حرام کہی گئی، اسے حلال گردانا۔ اسی بات سے اس اصول کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے: اس اصول کو مانیں تو ایک چیز حلال ٹھہرتی ہے، نہ مانیں تو حرام۔ لیکن اس کے باوجود امام مالک اور امام شافعی رحمہما اللہ کی قدر و منزلت مسلّم ہے۔ وہ مسلمان ہی نہیں؛ وہ ہمارا فخر ہیں؛ ہمارے سر کا تاج بھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہم مان لیتے ہیں کہ مدمقابل فریق نے ایسی اصل یا عقیدہ کا انکار کیا ہے، جو حق و باطل کا معیار ہے۔ ایسی صورت حال میں دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کیا ہم نے مخالف فریق کی غلطی کو احسن طریقے سے واضح کیا ہے۔ عام طور پر ہم اپنے زعم میں سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ہم نے کسی موضوع کی تحقیق و تدقیق میں قلم توڑ دیا ہے، جب کہ معاملہ صرف "فیس بک" کی اکادکا پوسٹس کا ہوتا ہے۔ ہماری نظر میں تمام علمی موضوعات پر سیر حاصل تحقیق کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر علمی موضوع ایک مکمل پروجیکٹ کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہے، جیسے آپ پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کا کام اپنے ذمہ لیتے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ اہم، بالخصوص جب آپ اس تحقیق کے نتیجے میں کسی شخص کے باطل پر ہونے کا فیصلہ کرنے جارہے ہو۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ یہ فیصلہ دو چار تبصروں اور تاثرات کا نتیجہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ دین اور

علم دین کے ساتھ زیادتی ہے۔ اپنے اسلاف کے علمی کاموں پر نظر دوڑائیے۔ کیا آپ کو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ ایسے سنجیدہ علمی موضوعات کو تبصروں اور تاثرات کی نظر کرتے تھے۔ ہم اپنے اسلاف سے کس قدر کٹ گئے ہیں۔ نہ ہم نے ان کے علمی ورثہ کی کوئی قدر کی اور نہ ان کے علمی منہج کو اختیار کیا۔ اسی لیے آج ہمارا یہ حال ہے۔

ایک مسلمان کے حوالے سے ہمیں قوی امید ہونی چاہیے کہ وہ باطل سے دور بھاگے گا اور حق کو اختیار کرے گا۔ ہم اس امکان کی نفی نہیں کرسکتے کہ وہ غلطی کے واضح ہونے پر اس غلطی سے تائب نہیں ہو گا۔ اگر یہ بات ٹھیک ہے، تو مکالمہ کے آغاز کسی بھی منفی بات سے کرنے کی بجائے مثبت رنگ میں ہونا چاہیے۔ ایک دوسرے پر کسی بھی طرح کا لیبل لگانے سے احتراز کرنا چاہیے۔ کلام میں شائستگی ہونی چاہیے۔ دوسرے کا احترام مجروح نہیں ہونا چاہیے۔ محض اصلاح کی نیت سے اس کام کو سرانجام دینا چاہیے۔ غلبہ حاصل کرنے کا جذبہ غالب نہیں آنا چاہیے۔ دوسرے کے مبلغ علم کو نہیں ماپنا چاہیے۔ اسے نیچا دکھانے کی جستجو نہیں کرنی چاہیے۔ اپنی بات کو صاف اور واضح الفاظ میں بیان کرنا چاہیے۔ اپنے موقف کے حق میں ٹھوس دلائل پیش کرنے چاہیے۔ اس سب کے باوجود یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ ہمارا مخاطب فورا اپنی غلطی مان کر ہمارے قدموں میں گر پڑے گا۔ ذہن انسانی بہت پیچیدہ چیز ہے۔ کوئی بات فورا سمجھ میں آجاتی ہے اور کوئی مدت کے بعد۔ ہمیں ابلاغ کی کوشش کرنی چاہیے؛ اتمام حجت میں نہیں پڑنا چاہیے۔

حاصل کلام

حاصل کلام یہ ہے کہ حدیث اور فہم حدیث کا موضوع ایک دینی، علمی اور فنی بحث ہے۔ اس دائرے میں کلام کرنے کے لیے اس موضوع کے دینی، علمی اور فنی پہلوؤں پر کامل گرفت کی ضرورت ہے۔ یہ کسی ایسے عالم ہی کا کام ہو سکتا ہے، جس نے اس موضوع کا علم حاصل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ وہی عالم کسی کہ بارے میں طے کرنے کا مجاز ہے کہ وہ ''منکر حدیث'' ہے۔ یہ انتہائی ذمہ داری کا معاملہ ہے۔ اس

میں دینی، علمی اور اخلاقی ذمہ داری کا مکمل احساس ہونا اشد ضروری ہے۔ کسی کو "منکر حدیث" کا عنوان اسی صورت میں دیا جا سکتا ہے جب اس سے مکالمہ کی تمام صورتیں بند کرنا مقصود ہو۔ اگر کوئی شخص انکار حدیث کے موقف کو درست سمجھتا ہے، تو وہ اس عنوان پر خوش ہو گا اور اپنے ناقد کی تحسین کرے گا۔ جو شخص انکار حدیث کہے جانے پر ناراض ہوتا ہے اور اس الزام کو غلط ثابت کرنے کے لیے استدلال کرتا ہے، اسے "منکر حدیث" کہنا اس سے مکالمہ قطع کرنے کے مترادف ہے: وہ منکر حدیث کہنے والے سے کسی معنی خیز مکالمہ میں شرکت کرنا پسند نہیں کرے گا۔ چناچہ "منکر حدیث" کا عنوان لعان کی مانند ہے۔ بلکہ یہ ایک بلند گلی ہے۔ اس عنوان کو دینے کا عمومی مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ عوام الناس کو "منکر حدیث" کے شر سے بچایا جائے۔ اس لیے حتی الامکان کوشش کرنی چاہیے کہ اس عنوان سے گریز کیا جائے، تاکہ مکالمہ جاری رہے۔ بہر حال یہ فیصلہ کسی عالم فاضل کی صوابدید پر ہی چھوڑا جا سکتا ہے۔ لیکن اس عالم کو یہ بات ذہن میں ضرور رکھنی چاہیے کہ اس عنوان کو صحیح العقیدہ مسلمان پر چسپاں کرنے کہ نتائج آخرت میں اسی قدر بھیانک ہو سکتے ہیں، جس قدر خطرناک نتائج کا سامنا "منکر حدیث" کے شر سے عوام الناس کو نہ بچانے کی صورت میں کرنا پڑے گا۔ واللہ اعلم بالصواب

جہانگیر حنیف

24 اگست، 2016

لاہور، پاکستان